مظفر علی سیّد کی تنقید کے اوّلیں نقوش

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی

ABSTRACT:

The literary culture of Government College, Lahore had left deep in print on the grooming of Muzaffar Ali Syed. He was appointed Editor of the literary magazine of the Government College 'TheRavi' in 1950-52 and wrote several editorials and literary articles on contemporary literary trends during that period. In 1950-52 the literary landscape was changed of for numerous changes. His critical writings penned down in those day's chronicle the literary history of those days and reflect the evolution of his mind scape. This paper projects the formative phase of Muzaffar Ali Syed as critic.

مظفر علی سید کی تنقیدی بصیرت ، وسعتِ مطالعہ اور حافظے کا زمانہ گواہ ہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں جو احباب ان کے ساتھ بیٹھتے تھے وہ سبھی قدآور شخصیات ہونے کے باوجود مظفر علی سید کی تنقیدی صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ کے سامنے دم نہیں مارتے تھے۔ مظفر علی سید کے ساتھ المیہ یہ گزرا ایک زمانے تک ہم یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے تنقیدی مضامین کی کتابی صورت میں اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان کا کام رسائل و جرائد میں بکھرا ہوا ہے یا محفلوں میں زبانی روایت کا معدوم تر حصہ بن گیا ہے۔ میں نے باری علیگ کو تو نہیں دیکھا، منٹو کے خاکے کی مدد سے ان سے واقف ہوا ہوں، تب مظفر علی سید کو دیکھ کر باری علیگ یاد آتے تھے کہ قہوہ خانوں میں چائے کی بھاپ اور سگریٹوں کے دھویں میں نگارِ زندگی کا سرمایہ کس طور صرف ہوا۔ مشفق خواجہ نے نہ جانے کس طرح ہمت کر کے **تنقید کی آزادی** مرتب کر ڈالی۔ مظفر علی سید کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سہیل احمد نے ان کے مقالات کی یک جائی اور اشاعت کا منصوبہ گورنمنٹ کالج میں بیٹھ کر بنایا اور اس کی تکمیل میں انھیں اس حد تک کامیابی ضرور ملی کہ انھوں نے مظفر علی سید کے خاکوں پر مشتمل کتاب **یادوں کی سرگم** کے عنوان سے گورنمنٹ

کالج کے شعبہ ءاردو سے شایع کر دی۔ اس کتاب کی اشاعت سے کئی غلط فہمیاں دور ہوئیں اور معلوم ہوا کہ ان کی کتب کی اشاعت نہ ہو سکنے کے کچھ تہذیبی عوامل بھی تھے ۔سہیل احمد خان ان دنوں مظفر علی سید کے صاحبزادے سے رابطے میں تھے اور اکثر بتایا کرتے تھے کہ ان کے مضامین کی تین جلدیں ملنے کو ہیں۔ سہیل احمد خان کا عزم تھا کہ ان کے تنقیدی مقالات کی جلدیں گورنمنٹ کالج کے شعبہ ءاردو ہی سے شایع کی جائیں گی۔اسی دوران میں سہیل احمد خان کا انتقال ہو گیا اور مظفر علی سید کے مضامین کی یک جائی کا سلسلہ بھی دم توڑ گیا۔تحقیق کرنے والوں نے ان پر ایم ۔فل اور ڈاکٹریٹ کے مقالات لکھ مارے لیکن اصل کام ہنوز تشنہ ہے۔ **یادوں کی سرگم** کے پیش لفظ میں سہیل احمد خاں نے ان کی کتب کی اشاعت نہ ہو سکنے میں جہاں خود ان کی افتادِ طبع کا دخل محسوس کیا تو وہاں اس امر میں مانع کچھ تہذیبی عوامل کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ان کے بھانجے شبیب حیدر علی سید کے خیال میں وہ پبلشرز کے مفت خورے پن سے کبھی سمجھوتا نہ کر سکے۔ ان کے صاحبزادے مثمر علی سید کے نزدیک انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے تصانیف کی فہرست ، کتب کے عنوانات اور فہرستِ مشمولات خود اپنی ڈائری میں درج کر رکھی تھی۔ ان کے مجوزہ عنوان کے تحت حال ہی میں سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے **سخن اور اہلِ سخن** کی اشاعت ہوئی ہے جسے انتظار حسین نے مرتب کیا ہے۔

ہمیں فی الوقت مظفر علی سید کی تنقید کے اولین نشانات کو سامنے لانا مقصود ہے جو اتفاق سے گورنمنٹ کالج ،لاہور کی روشن روایت کا حصہ ہیں۔مظفر علی سید کی تنقید کے اولیں نقوش ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک کے دو سالوں کے عرصے پر محیط ہیں۔مظفر علی سیّد کو گورنمنٹ کالج، لاہور میں جو علمی و ادبی فضا میسر آئی اور ہاسٹل میں جن احباب کا حلقہ انھیں حاصل ہوا، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مظفر صاحب کے اداریوں اور شخصیت کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ تو اس فضا کا بھی ہو سکتا ہے۔مظفر علی سیّد، کالج کے نیو ہاسٹل میں مقیم رہے۔صوفی تبسم ان دنوں نیو ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کے زمانے میں نیو ہاسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہاؤس، لاہور کے ادبی اجتماعات کا مرکز تھا۔ ہاسٹل میں جاوید شاہین، غالب احمد، حنیف رامے، شہزاد احمد، اختر احسن اور مقبول الٰہی ان کے ہم مشرب و ہم راز تھے۔ کالج میں خواجہ منظور حسین، قیوم نظر، ڈاکٹر محمد صادق وغیرہ ایسے صاحبانِ فکر و نظر کی رہنمائی انھیں حاصل تھی۔مجلّہ راوی کے سابق مدیران میں پطرس بخاری، سیّد امتیاز علی تاج، ن ۔م۔ راشد اور ضیا جالندھری کی درخشاں میراث انہیں ملی تھی۔ اس کہکشاں نے مظفر علی سیّد کو جنم دیا۔ ذاتی اور انفرادی سطح پر صلاحیتوں سے مفر نہیں لیکن اس وقت تک بڑا آدمی پیدا نہیں ہوتا جب تک معاشرتی سطح پر تخلیقی رو اس بہاؤ میں معاونت کا فریضہ ادا نہ کرے۔مظفر علی سیّد کے اداریوں کے پسِ پردہ مذکورہ فضا نے محرک قوت کا کردار ادا کیا۔صوفی تبسم ، خواجہ منظور حسین اور قیوم نظر کی تربیت کے زیرِ سایہ جدید ادب کی ایک نئی نسل نے گورنمنٹ کالج میں ہی آنکھ کھولی جن میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مظفر علی سید، شہزاد احمد، غالب احمد، جاوید شاہین ،عرش صدیقی ،اختر احسن، انیس ناگی اور مقبول الٰہی قابلِ ذکر ہیں۔اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک مشاہیرِ ادب کی درخشاں روایت کا تعلق گورنمنٹ کالج، لاہور سے ہے۔گورنمنٹ کالج کی مجلسی علمی و ادبی فضا نے مشاہیرِ زمانہ کے

ادبی رویوں کی اولیں ساخت میں بنیادی کردار ادا کیا۔مظفر علی سید ان مشاہیر میں سے ایک ہیں کہ جن کی ادبی تربیت میں گورنمنٹ کالج کا کردار دکھائی دیتا ہے۔

مظفر علی سیّد نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی مجلّے راوی کی کرسی ادارت سنبھالی تو اُردو ادب کئی تبدیلیوں کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ افسانے میں منٹو، غلام عباس، بیدی اور کرشن چندر کی حقیقت نگاری اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور کسی نئے امکان کی تلاش میں تھی۔فراق اور ان کے ہم عصر غزل گو شعرا جبکہ راشد اور فیض کی نظم کے بعد جدید تر شاعری کا ڈول پڑنے ہی والا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو مظفر علی سید زمانی اعتبار سے اس خطے میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے جو مسافتوں کی قدیم منازل اور نئے رستوں کے درمیان ایک پگڈنڈی کی صورت میں کام دیتا ہے۔ ان کے اولیں اداریے کا عنوان ''روایت اور اجتہاد'' اس بدلتی ہوئی ادبی فضا کا نقشہ سامنے لاتا ہے۔مظفر علی سید نے راوی کے اداریوں میں اجتہاد سے کام لیا۔انہوں نے اپنے اداریوں میں نہ تو طلبا و طالبات کے ادبی شعور کا گلہ کیا اور نہ ہی ان مشکلات کا تذکرہ کیا جو کسی تعلیمی ادارے کے مجلّے کی تشکیل میں پیش آتی ہیں۔انھوں نے اپنے زمانے کے ادبی مباحث کو اداریوں میں یوں پیش کیا کہ نئی نسل کے فکری رجحان کی آئینہ داری اس سے ہوتی چلی گئی۔کم و بیش چالیس برس بعد اپنے زمانہء طالب علمی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''یہ بھی خیال آیا کہ راوی کا اداریہ اس کے مشمولات سے بحث کرنے یا معاونین کو متعارف کرانے کی بجائے کسی مروج ادبی بحث کے بارے میں نئی نسل کا مؤقف ایک مختصر مقالے کی صورت میں بیان کرے۔''[۲] مظفر علی سید کے سامنے 'مروج ادبی بحث' سے مراد روایت اور جدید رویوں کی کشاکش تھی۔گمان ہے کہ مظفر علی سید کے سامنے ن۔م۔راشد، میرا جی اور فیض احمد فیض ایسی تازہ اور نمائندہ مثالیں موجود ہوں گی کہ جنھوں نے اردو کی ادبی روایت سے ہٹ کر نیا آہن، ہیئت اور نئی فکر اردو شاعری کو عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اردو کی روایت کے داعی محمد حسن عسکری کے خیالات بھی ان کے پیش نظر ہوں گے جو مولانا حالی کو ادبی روایت کے خاتمے کا باعث سمجھتے تھے اور روایت کے پرزور حامی تھے۔ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا بھی ان دنوں نیا نیا شہرہ تھا جس کے ہاں روایت پسندی کا غلبہ ہے۔مظفر علی سید نے 'راوی' کے لیے اولیں اداریہ اسی مروجہ ادبی بحث پر تحریر کیا۔ان کا یہ اداریہ 'راوی' نومبر ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔

مظفر علی سید کے ہاں روایت کا تصور وسیع ہے۔انھوں نے کسی ایک قوم، خطے یا تمدن کی ادبی روایت کو اردو تک محدود نہیں سمجھا بلکہ اس میں دکن کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی شاعری کی روایات کو شامل کر کے اس کے دامن کو وسیع تناظر میں دیکھا۔دکنی، فارسی اور ہندی شاعری کی روایات کا امتزاج ان کے نزدیک کلاسیکی روایت کو متشکل کرتا ہے۔اس وسیع روایت پر انھوں نے سوال اٹھایا:

> ''کیا ہمیں ان روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہیے؟ کیا اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتے رہنا چاہیے؟ روایات، وراثت کا درجہ نہیں رکھتیں۔انفرادی ترکہ روایات سے کسی طرح مشابہ نہیں کیوں کہ تہذیبی وراثت ضایع ہونے والی چیز نہیں۔اردو زبان و ادب کی روایات انفرادی روایت سے کہیں زیادہ مستحکم بنیادوں پر قایم ہیں۔۔۔اپنے زمانے میں اسے ان

روایات کی شکلوں میں ردوبدل سے بھی کام لینا پڑتا ہے مگر ان کی روح وہی رہتی ہے۔ ادب میں ہئیت کے تجربوں کی راہ بند نہیں ہوتی مگر اپنے قومی مزاج کا سمجھنا اور اس میں گھل مل جانا اس کے لیے شرط ہے۔'' (۱)

مظفر علی سید کے نزدیک اجتہاد کے لیے روایت کی فہم ضروری ہے۔انھوں نے اپنے اس اداریے میں علمِ دین کے مراحل میں استخراجِ مسائل کی مثال دی کہ اس کے سیکھنے میں برسوں صرف ہوتے ہیں تو کہیں فتویٰ دے سکنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ان کے خیال میں ہمیں روایت میں گھل مل کر اس کا مزاج معلوم کرنا چاہیے اور پھر اس میں اضافہ کر کے اپنی زندگی کی دلیل سامنے لانی چاہیے۔مظفر علی سید کے نزدیک انفرادیت بڑی اچھی چیز سہی لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے،اجتہاد کے لیے مل بیٹھنا بھی ضروری ہے۔مظفر علی سید نے اپنے اس اولین اداریے میں روایت اور اجتہاد کو الگ الگ روپ میں نہیں دیکھا بلکہ اجتہاد کے لیے روایت شناسی کی اہمیت پر زور دیا۔ **راوی** کے اس شمارے کے مشمولات سے اندازہ ہوتا کہ بہ طور مدیرِ **راوی**، ان کی نظر اجتہاد پر زیادہ رہی، تاہم انھوں نے قندِ پارسی کے عنوان سے الگ سے ایک گوشہ بھی مختص کیا۔

مظفر علی سید نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اور جس ادبی فضا میں وہ پروان چڑھے ، اس میں تنقیدی نشستوں، ادبی محافل، نظریاتی محاذ آرائی، رسایل و جراید کی اشاعت، اخباروں میں ادبی کارناموں کی تفصیل، سستی شہرت کے حصول کے لیے کاوشوں کا خاصا عمل دخل تھا۔مظفر علی سید ان تمام تر ادبی رویوں سے آگاہ بھی تھے اور عینی شاہد بھی۔ اپنے زمانہ ء طالب علمی ہی میں وہ پاک ٹی ہاؤس سے وابستہ ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کے زمانے تک باقاعدگی سے ٹی ہاؤس آتے رہے۔ان کی خواہش تھی اور وہ خود بھی اس پر عمل پیرا رہے کہ درست علمی و ادبی فضا کو تشکیل دیا جائے جس کے لیے مذکورہ بالا کاوشوں کی چنداں ضرورت نہیں۔درست علمی و ادبی فضا سے مراد لکھنے پڑھنے کی فضا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کو انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے 'راوی' میں 'ہماری ادبی فضا' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا:

'' ادب میں دلچسپی رکھنے کا دعویٰ تو ہم بہت کرتے ہیں مگر ادبی ذوق کی ترویج کے لیے جو فرایض ہمارے ذمہ ہیں،ان کے انجام دینے کا موقع آنے ہی نہیں پاتا۔ ادیبوں کی متحدہ کوششیں جہاں لکھنے پڑھنے کی ایک فضاء پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں، وہاں پڑھنے والوں کے مذاق کو سدھارنے اور بلند کرنے میں بھی ان کی مساعی مشکور ہوسکتی ہیں۔ بات صرف محسوس کرنے اور کچھ کر دکھانے کی ہے۔'' (۲)

مظفر علی سید اور ان کے معاصرین نے جس ادبی فضا کی تشکیل کی، اس پر آج نظر ڈالنے کی زیادہ ضرورت ہے۔مظفر علی سید کے نمایاں معاصرین اور قریبی ساتھیوں میں انتظار حسین ،محمد سلیم الرحمٰن، شاہد حمید، جاوید شاہین، اکرام اللہ ،حنیف رامے، غالب احمد، زاہد ڈار اور قدرے بعد میں ان کے قریب ہونے والوں میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور مسعود اشعر شامل ہیں ۔ یہ سبھی لوگ غیر معمولی طور پر پڑھنے لکھنے والے لوگ ہیں۔ ایک آدھ نام کو چھوڑ کر

سبھی خود پسندی، خود نمائی سے کوسوں دور رہنے والوں میں شامل تھے۔ جو لوگ محمد سلیم الرحمٰن، شاہد حمید، اکرام اللہ، زاہد ڈار، سہیل احمد خاں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ یہ سبھی گروتقریبات، انجمن سازی، رسائل و جرائد میں اشاعت وغیرہ سے کس حد تک بلند تر رہے۔ ان تمام لوگوں نے ایک ایسی ادبی فضا کو جنم دیا جس میں ترویجِ ذات کے لیے کوئی گوشہ نہیں تھا۔ مظفر علی سید بھی انھی میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایسی ادبی فضا کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اپنے ادبی رویے سے اسے تعبیر بھی کیا کہ جس میں پڑھنے لکھنے والوں کا مذاق بلند تر ہو سکے اور اس کا اندازہ مذکورہ ادارےیے کے ساتھ مشمولات سے بھی ہوتا ہے۔ ادبی نقاد کا فریضہ ہے کہ ایسی فضا کی تشکیل کے لیے آس پاس کے لوگوں کو نہ صرف اکسائے بلکہ اپنی تحریر کے بل بوتے پر اس فضا کی نشان دہی بھی کرے۔ مظفر علی سید طالب علمی کے زمانے ہی سے اس رمز سے آشنا تھے اور اپنی ابتدائی تحریروں میں ہی انھوں نے اس اہم امر کی طرف واضح اشارہ کیا کہ انجمن سازی، جماعت کی تشکیل اور ذرائع ابلاغ کے پیچھے بھاگنے سے کہیں بہتر ہے کہ ادبی ذوق کی ترویج کی جائے اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب پڑھنے لکھنے کی فضا بنائی جائے گی۔

مظفر علی سید کے لب و لہجے میں کاٹ، کسی حد تک سطحیت پر استہزا، اپنے موقف پر تیقن بھرا انداز ان کی تنقید کا نمایاں وصف رہا جس کا آغاز ان کے زمانہء طالب علمی کے دور کی تحریروں سے ہو گیا تھا۔ **راوی** مئی ۱۹۵۱ء کے شمارے میں انھوں نے 'ادب اور بنیا پن' کے عنوان سے بھر پور اداریہ لکھا جو ان کی تنقید میں بعد ازاں پیدا ہونے والے رجحانات سے قریب تر ہے۔ اس اداریے میں انھوں نے فوری مقصد کے تحت لکھے جانے والے ادب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا حالی اور علامہ اقبال کی شاعری کا تجزیہ جہاں پیش کیا تو وہاں ترقی پسند ادب کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں وہ پرآشوب زمانے جو معاشی اور سماجی ابتری کے اعتبار سے ہم سے کوسوں آگے تھے، ان زمانوں میں بھی غیر مادی قدروں سے وابستگی ان کے ہاں زیادہ تھی۔ مظفر علی سید کے نزدیک افادی قدروں میں معقولیت کا تقاضا ہے کہ محض فوری مقصد ہی اس طور سامنے نہ رہے کہ اس کے سامنے قومی زندگی کے باقی تقاضے فراموش ہو جائیں اور بات محض نعرے لگانے تک محدود ہو جائے۔ مولانا حالی کے بارے میں قدرے سخت بات کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> ''شعر و ادب کے بے مصرف ہونے کا احساس گو خصوصیت سے ہمارے ہی زمانے میں پیدا نہیں ہوا مگر اب سے بیس پچیس سال پہلے بھی جب یہ شور بہت سننے میں آتا تھا، یہ احساس نوعیت کے اعتبار سے اتنا شدید نہیں تھا۔ حالی کے زمانے میں شعر کی فوری افادیت دریافت کرنے کی جو خواہش نظر آتی ہے، وہ اسی احساس کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں پانچ سات مثالوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی کی لڑکیوں کو بر نہ ملتا ہو تو شاعری سے لوگوں کو اُکسانے کا کام لیا جا سکتا ہے، بادشاہ ہرات میں آ کر ملنے کا نام نہ لے تو اسے وطن کی یاد شاعری سے دلائی جا سکتی ہے، قوم میں انقلاب کی ضرورت ہو تو شاعر اپنی آتش نوائی سے لوگوں کے جذبات میں آگ لگا کر انھیں آزادی کے لئے لڑنے پر مائل کر سکتا ہے۔ اس نقطۂ

نظر پر انہوں نے خود عمل بھی کیا۔ گو ان کی تمام تر شاعری فوری مقاصد ہی کے پیش نظر نہیں لکھی گئی پھر بھی یہ نقطۂ نظر ان کی قومی شاعری میں عام طور پر کارفرما ہے۔''(۳)

مظفر علی سید کے نزدیک قوموں میں 'مذاقِ سخن' کا اہم حصہ ہوتا ہے۔فوری مقصد کے حصول کی آرزو اس ذوق کے منافی ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کو اسی لیے قبول کیا کہ ان کے ہاں فنکارانہ عنصر موجود رہا۔حافظ کو قومی مزاج کی بدولت رد کرنے کا رویہ اگرچہ مولانا حالی سے دو قدم آگے بڑھنے کا رویہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی مظفر علی سید کے ہاں اقبال کے باب میں قبولیت برقرار رہی تو اس کی بنیادی وجہ اقبال کے ہاں جمالیاتی قدروں کی موجودگی ہے جو شاعری کی اساس ٹھہری۔اقبال کے حوالے سے اس اداریے میں لکھتے ہیں:

''اگر خدانخواستہ وہ محض قومی درد کا شکار ہی ہو کر رہ جاتے تو ہماری تمدنی روایت میں ایک اہم کڑی غائب ہو کر رہ جاتی۔ان کا نظریہ مہدی حسن یا سجاد انصاری کی طرح خالص جمالیاتی بے شک نہیں ہوا مگر ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جمالیاتی قدروں کے بھی منافی نہیں تھا''(۴)

پچاس کی دہائی کے اولیں برس ترقی پسند تحریک کے عروج کی داستان سناتے ہیں۔اس زمانے میں کسی طالب علم مدیر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار اپنے مجلّے کے اداریے میں کر سکتا ہے۔مظفر علی سید نے ایک صاحبِ نظر نقاد کی مانند اپنا موقف پیش کیا جو قدرے سخت بھی ہے اور حلقہ اربابِ ذوق کی ہم نوائی بھی اس سے جھلکتی ہے۔مظفر علی سید کبھی بھی ترقی پسند تحریک کے شدت پسند مخالف نہیں سمجھے گئے، ان کا اختلاف اصولوں کی بنا پر تھا۔اپنے اس اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ادب کے حرفِ آغاز کا پتا چلایئے تو یہی بنیا پن ہے۔ یہ بنیا پن حالی یا اقبال کے افادی نقطہ ہائے نظر سے کہیں زیادہ شدید اور خطرناک ہے۔ جو بات حالی یا اقبال سے نہ ہو سکی، وہ کئی ایک ترقی پسند ادیبوں کا منتہائے مقصود ہے۔عصمت چغتائی ادب کے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے اگلے پچھلے ادبی کارنامے کو مٹا دینے پہ مایل ہوگئیں تو یہ انہی کی ہمت ہے۔ کرشن چندر نے اپنی تمام تر مساعی محض جنتا کے مفاد کی خاطر صحافت نما ادب کے لئے وقف کر ڈالیں۔کیفی اعظمی کے سلسلے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ جب کبھی ان کی سیاسی جماعت اپنی پچھلی قرار دادوں کو منسوخ قرار دے کر حالات کے مطابق کوئی نئی قرار داد منظور کرتی تھی تو وہ اپنی پچھلی نظموں کو بنفس نفیس پھاڑ دیا کرتے تھے (یہ معلوم نہیں کہ ان کی بعد کی نظموں کا کیا حشر ہوا!) تخلیقِ ادب کے سلسلے میں پہلے سے کاروباری یا جماعتی پابندیاں عائد کر کے بیٹھ رہنا اور اپنی اگلی پچھلی تخلیقات سے مطمئن ہو رہنا آج کل کے افادی نقطۂ نظر کا فیضان ہے۔''(۵)

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا اور افسانہ نگاروں کے بارے میں مظفر علی سید کا سخت گیر موقف صرف اس تحریک کے باب میں نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے اداریوں میں ترقی پسندوں کے سب سے بڑے مخالف محمد حسن عسکری کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔محمد حسن عسکری کے نظریات کے بارے میں مظفر علی سید کے تحفظات سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ان کے نزدیک ہر وہ نظریہ جو ادب کی قدروں سے مطابقت نہ رکھتا ہو، نا قابلِ قبول ہے۔مظفر علی سید کا زمانۂ ادارت دو برسوں (۵۲-۱۹۵۰ء) پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب محمد حسن عسکری نے ادبی جمود کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا اور ادبی حلقوں میں اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث چل رہی تھی۔مظفر علی سید نے جون ۱۹۵۱ء کے شمارے میں ''موجودہ ادبی جمود' کے عنوان سے بڑا تیز اداریہ تحریر کیا۔ اگرچہ انتظار حسین کے کالم اور مضامین ادبی جمود کی مخالفت میں لکھے جا رہے تھے لیکن مظفر علی سید نے اپنے اداریے میں جن دلائل کے ساتھ ادبی جمود کو ادبی روایات کے تناظر میں پرکھ کر پیش کیا، اس کی نظیر کم ہی ملے گی۔مثال کے طور پر وہ ادبی جمود کے ایک نازک پہلو کو چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عسکری صاحب کو پاکستانی ادب سے یہ گلہ ہے کہ پاکستان میں ایک اکیلی نہر کا کھود ڈالنا اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ کئی افسانے، مضمون اور نظمیں تو اس پر لکھی جانی چاہئیں تھیں مگر ادبی جمود کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ کسی نے اس مہتمم بالشان قومی کارنامے پر دوحرف تک نہ لکھ کر دیے۔ اگر ادبی جمود کا اندازہ یہیں سے ہونے لگے کہ رسول ہیڈ پر کوئی نظم نہیں لکھی گئی، فلاں جگہ اتنی قوت کا ایک بجلی گھر بنا ہے، اس پر کوئی افسانہ نہیں ہوا تو پھر تو پرانا ادب بھی ساکن و جامد ہو کر رہ جائے گا۔'' (۶)

مظفر علی سید کو مولانا حالی سے گلہ رہا، دو متحارب نظریات کے داعی محمد حسن عسکری اور کرشن چندر سے بھی شکوہ رہا۔آپ ہر اس ادبی رویے سے نالاں رہے جو فوری مقصد کے حصول کی غرض سے تحریر کیا گیا۔اس ضمن میں انھوں نے علامہ اقبال کے بارے میں بھی اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ اگرچہ انھیں کسی تنقیدی اصطلاح میں مقید نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی تنقید کے اولیں نقوش انھیں رومانی اور جمالیاتی تنقید کے قریب کرتے نظر آتے ہیں۔اس طور آپ کو جمالیاتی اور فنکارانہ عناصر کے حامل ادب کی تحسین کرنے والوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ممکن ہے کہ اس میں حلقہ اربابِ ذوق کا بھی کچھ عمل دخل ہو جس کی تنقیدی نشستوں میں آپ زمانہ ء طالب علمی میں باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔حلقہ اربابِ ذوق میں ان کی آمد کے بارے میں انتظار حسین نے بھی اپنی یادداشتوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔(۷)۔ان کے اداریوں سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک اور محمد حسن عسکری سے محض اس سے نالاں رہے کہ ان کے نزدیک نظریہ کی ترویج کے زیرِ اثر فوری مقصد کے حصول کی خاطر لکھے جانے والا ادب محض نعرہ بن کر رہ جاتا ہے اور اپنی جمالیاتی قدروں کو کھو بیٹھتا ہے۔' موجودہ ادبی جمود' کے عنوان سے لکھے جانے والے اداریے میں انھوں نے ممکنہ مسائل کا تذکرہ کیا۔ان کے خیال میں صحافتی ادب موجودہ ادبی جمود کی ایک اور اہم وجہ ہے۔انھوں نے تفصیل سے کاروباری رسائل کا تذکرہ اپنے اس اداریے میں کیا کہ نام کمانے اور گزارہ چلانے والے ادیبوں کے پاس کہنے کو نئی بات نہیں ہے، اس لیے بہ ظاہر جمود کا گمان ہوتا ہے۔انھوں نے نئی نسل کی وسعتِ مطالعہ اور تخلیقی امنگ پر اطمینان کا اظہار کیا۔ان کے زیرِ ادارت گذشتہ رسائل اور موجودہ رسالے کے مشمولات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نئی نسل سے مراد کون لوگ ہیں۔

نومبر ۱۹۵۱ء کے 'راوی' میں مظفر علی سید کا اداریہ 'شاعری کا ایک رومانی تصور' شایع ہوا جس کا آغاز 'فن کی محبت میں ہماری حقیقی محبت کا نقصان ہے' (۸) کے فرانسیسی قول سے ہوا ہے۔مظفر علی سید نے فلابیر، مومن، آبرو، فراق اور جوش کی تخلیقات کی مدد سے مجرد خیال اور مادے کی تفریق نہ صرف واضح کی بلکہ اردو شاعری کے رومانی تصور میں موجود محبوب کے فراق سے وابستہ ان کیفیات کا جائزہ لیا ہے جو شاعری کی ابتدا کا باعث ہوتی ہیں۔جنوری ۱۹۵۲ء کے 'راوی' کے لیے انھوں نے 'مذاقِ سخن' کے نام سے لطیف موضوع پر اداریہ تحریر کیا۔ یہ موضوع ان کا پسندیدہ موضوع ہے کہ جس پر وہ گزشتہ اداریوں میں اظہارِ خیال کر چکے تھے۔اس اداریے میں انھوں نے اس موضوع پر ارتکاز کرتے ہوئے اس کی باریکیوں کو اجاگر کیا۔سماج میں پڑھنے لکھنے کی دھن اور صاحبِ علم لوگوں کی موجودگی سے تخلیق کار کی تخلیقی رو بلندی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ان کے خیال میں اصلی قاری اور تخیلی قاری میں بعدالمشر قین نہیں ہونا چاہیے۔عمدہ ذوقِ سخن ہی سے اس بعدالمشر قین کو کم کیا جا سکتا ہے:

> ''یہ سیدھی سی بات سمجھنا تو محققین کی سمجھ سے بالاتر ہے (کیونکہ اس کے لیے شاید انھیں تاریخی شواہد اور قلمی نسخے نہ مل سکیں) کہ شاعر کے ذہن میں ایک تخیلی قاری بھی ہوسکتا ہے، جو اس کے شعر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور جب اصلی قاری اور تخیلی قاری میں بُعد مشرقین واقع ہو تو اس کا اثر یا تو شعر کہنے والے پر اس طرح پڑتا ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنی دُنیا الگ بنا لیتا ہے اور کسی بہت سے منفرد قسم کے اندازِ سخن کی تعمیر میں مصروف ہو جاتا ہے اور یا پھر اپنی کمتری کے احساس سے ہی مرا جاتا ہے۔'' (۹)

مظفر علی سید نے ادب اور سماج کو الگ الگ صورتوں میں نہیں دیکھا اور نہ ان دونوں کو علیحدہ اکائی کے طور پر تسلیم کیا۔ان کے ہاں سماج اور ادب کی باہمی اثر پذیری ترقی پسندانہ سوچ سے یکسر مختلف ہے۔ وہ ایسے سماج کی تشکیل پر زور دیتے رہے جو شستہ ذوق کا حامل ہو، رسایل و جراید معیاری ہوں، لوگوں میں ادب کی تفہیم کا معیار بلند ہو، ادبی محافل آباد ہوں اور شعر و سخن کے گلدستوں میں رنگ و بو کا سیلاب محسوس کیا سکے۔اس طور ان کا نظریہ ادب و سماج مثالی اور تخیلاتی دکھائی دیتا ہے۔اس موضوع پر انھوں نے ایک سے زیادہ اداریے تحریر کیے۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے میر کے مصرعے ع نہیں رہتا چراغ ایس پون میں کو سامنے رکھتے ہوئے 'نہیں رہتا چراغ' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا اور ان لکھنے والوں کی جانب توجہ مبذول کرائی جو ایک آدھ اچھی چیز لکھ کر غائب ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا نشان نہیں ملتا۔ ایک آدھ عمدہ تحریر چھوڑ کر گرہستی اور روزگار کی بھنور میں گم ہو جانے والوں کا المیہ اس اداریے کا بنیادی موضوع ہے۔ان کے نزدیک سماج میں ادب اور ادیب کی ناقدری کے ساتھ ساتھ خود ادبی فضا میں پڑھنے لکھنے کے رجحان کا نہ ہونا ادیبوں کی گم شدگی کی اہم وجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تخلیقِ ادب کی دنیا میں بچوں کی اموات کی شرح بھی کچھ کم خطرناک نہیں، گو اس پر کوئی مالی امداد اقوامِ متحدہ کی طرف سے کسی شق کی رو سے بھی نہیں مل سکتی۔'' (۱۰) اپنے اس اداریے میں انھوں نے ان امکانات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جو ادھوری تخلیق امنگ کے ادھورے پن کا باعث ہوتے ہیں۔

مظفرعلی سید کے اداریوں کے علاوہ ان کے چند مضامین بھی ان کے زمانہ ء طالب علمی کی یادگار ہیں اور ان کے تنقیدی نشانات کا نقشِ اول بھی ہیں۔ اس نوع کے تنقیدی مضامین میں ''میرا جی'' (۱۱) اور ''اقبال کی سوالیہ شاعری'' (۱۲) یہ دونوں مضامین شعرا کے فکر وفن پر تحریر کیے گئے ہیں جو مظفرعلی سید کی تنقیدی ترجیحات کا تعین بھی کر جاتے ہیں۔ میرا جی سے انھیں ایک گونہ انسیت کئی حوالوں سے تھی۔ حلقہ اربابِ ذوق کی نسبت کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ساتھ میرا جی کا فکری تعلق اہم ہے۔ مظفرعلی سید مغربی ادب کے بہت بڑے پارکھ تھے۔ مغربی ادب کے قد آور تخلیق کاروں سے اردو دانوں کے تعارف میرا جی کے توسط سے ہوا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میرا جی کی شخصیت کے گرد پراسراریت کا ہالہ اور فنکارانہ زندگی کا ڈھب بھی نئی نسل کے لیے مسحور کن رہا۔ اس طرح کی کئی توجیحات امکانات کی صورت ذہن میں آتی ہیں۔ میرا جی پر مضمون لکھتے ہوئے مظفرعلی سید نے ان کی شاعری، نثر، شخصیت میں جنسی رجحان اور وسعتِ مطالعہ کو اپنا محور بنایا۔

مظفرعلی سید کو ان ناقدین سے قدرے گلہ رہا جنھوں نے میرا جی کی وفات کے بعد ان پر مضامین تحریر کیے تھے۔ مظفرعلی سید کے خیال میں ان پر لکھنے والوں نے نفسیاتی بیماریوں کو ان کے فن پر آویزاں کیا اور شاید ہی کوئی نفسیاتی بیماری ایسی ہو جسے ان کے فن پر چسپاں نہ کیا گیا۔ ایسا ہی شکوہ ولہلم سٹیکل نے شیکسپیئر کے **ہملٹ** پر لکھنے والوں سے کیا تھا اور اتفاق سے سٹیکل پر شہزاد احمد کا مضمون مظفرعلی سید کے زیرِ ادارت **راوی** میں بعد ازاں شائع بھی ہوا۔ مظفرعلی سید کے خیال میں میرا جی کو عمر بھر جنس سے وابستگی رہی لیکن ان کی جنس سے وابستگی سطحی نوعیت نہیں تھی۔ ان کے ہاں جنسی رویے نفسیاتی بیماریوں کے سیدھے سادے اظہار پر ختم نہیں ہوتے بلکہ شعور کی ایک گہرائی ان کے تخلیق کردہ ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ مظفرعلی سید کے نزدیک میرا جی نے مغربی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور اس مطالعے کی وسعت کو جذبوں سے ہم کنار کرنے کے ہنر سے بھی آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جنسی موضوعات محض جنس اور جنسی رویوں کا خالی خولی اظہار بن کر سامنے نہیں آتے بلکہ اپنے عہد کے نمایاں رویوں کی روداد بن کر ابھرتے ہیں۔

میرا جی نہایت عمدہ مترجم تھے۔ **مشرق و مغرب کے نغمے** میں شامل نظموں کے تراجم سے اس کا بھر پور انداز میں ثبوت مل جاتا ہے۔ مظفرعلی سید کے بقول میرا جی نے 'کسی الہامی جذبے' کے تحت مشکل سے مشکل شاعر پر ہاتھ نہیں ڈالا بلکہ ان کے ہاں مطالعے کی گہرائی اور مقامیت ایک اہم عنصر ہے جو ان کے تراجم میں شعری تاثیر پیدا کر دیتا تھا۔ میرا جی کے تراجم میں موجود شعری تاثیر کی ایک وجہ جو مظفرعلی سید نے بیان کی وہ ان کا ہندوستانی مزاج ہے۔ مظفرعلی سید کے نزدیک میرا جی مغربی ادب کے حوالے سے نہایت وسیع مطالعہ ضرور رکھتے تھے لیکن ان کی فکر کے سوتے ہندوستان کی روایات سے بہت مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے، اس وجہ سے انھوں نے جس مغربی شاعر کے کلام کو اردو میں ڈھالا، اسے ہندوستانی شاعری کے مزاج میں منتقل کر کے پیش کیا۔ اس مضمون میں آپ لکھتے ہیں: ''میرا جی کے ترجموں میں شعری تاثیر کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کا مزاج سراسر ہندوستانی تھا'' (۱۳)

مظفر علی سید نے میرا جی کے اہم ادبی کارنامے **اس نظم میں** کو'' اردو میں عملی تنقید کا اولیں نمونہ۔''(۱۴) قرار دیا۔ میرا جی نئی نسل سے قرب رکھتے تھے اور اس قرب میں شفقت کا پہلو غالب تھا۔ کسی گم نام شاعر کی اچھی تحریر دیکھ لیتے تو احباب کے سامنے نہ صرف اس کا ذکر کرتے بلکہ اس پر تحریری شکل میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے۔ مظفر علی سید کے نزدیک اس باب میں ان سے تسامحات بھی ہوئے۔ سلام مچھلی شہری پر لکھتے ہوئے انھیں فیض سے بڑا شاعر قرار دے بیٹھے۔ مظفر علی سید نے جدید نسل سے ان کے انس کو سراہا ہے، نظموں پر ان کے تجزیات کو اردو میں عملی تنقید کی اولیں صورت بھی قرار دیا ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ان سے ہو جانے والی چوک کا بھی تذکرہ کیا ہے جو تنقید کی آزادی کی ایک مثال ہے۔

میراجی کی شاعری پر مظفر علی سید کا نقطہ ءنظر ان کی ابتدائی تحریروں میں واضح ہے۔ انھوں نے میرا جی کے ہندوستانی مزاج اور مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے امتزاج کی روشنی میں ان کے کلام کو پرکھا اور فتویٰ دینے والوں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں میراجی کی شاعری میں جن جذبات سے واسطہ پڑتا ہے، ان جذبات کی ساخت محض وفور پر نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں وسیع مطالعہ اور مشاہدہ موجود ہے:'' ان کا فلسفہ ایک ایسے مظلوم آدمی کا فلسفہ تھا جس نے جینے کا سکھ کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ان کے جذبات ایک ایسے آدمی کے جذبات تھے جس نے ادب، فلسفہ اور دیومالا کا وسیع مطالعہ کیا تھا'' (۱۵) اپنے اس مختصر مضمون میں مظفر علی سید نے میرا جی کے شخصی رجحانات کے ساتھ ساتھ ان کے تراجم اور تنقید کے حوالے سے نہایت اہم امور کی نشان دہی کی اور عمومی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا۔ میرا جی کی وفات کے بعد ان کے فکر وفن پر شایع ہونے والے مضامین میں اس مضمون کو اہمیت حاصل ہے، اگرچہ یہ مظفر علی سید کے زمانہ ءطالب علمی کی یادگار ہے۔

مظفر علی سید کے زمانہ ء طالب علمی کی تحریروں میں ''اقبال کی سوالیہ شاعری'' بھی قابلِ ذکر مضمون ہے۔ مظفر علی سید نے سوال کی روح کو اس مضمون میں اجاگر کرتے ہوئے اس حد کی نشان دہی کی جو سوالیہ شاعری کو بیانات کے سبب سپاٹ بنا دیتی ہے اور ان فنکارنہ عوامل کا تذکرہ بھی کیا جو سوال کو فن میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے مرزا غالب، دانتے، گوئٹے اور دیگر مغربی شعرا کی سوالیہ شاعری سے مثالیں دیں۔ مظفر علی سید کے خیال میں خبر یہ شاعری کے خطرات پر غلبہ پا لینا شاعر کا کمال ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں دانتے نے ڈرامائی کرداروں اور ڈرامائی بیانیہ کی مدد سے اپنے سوالات کو خبریہ شاعری بننے سے بچایا۔ ان کے نزدیک اقبال نے دانتے اور گوئٹے کی مانند اس خطرے پر قابو پایا:'' اقبال کی شخصیت اس طرح خبریہ شاعری کے خطرات پر غلبہ پانے کے لیے بڑھی جس طرح دانتے یا گوئٹے کی شاعری اپنے اپنے انداز میں بڑھی تھی'' (۱۶) مظفر علی سید کی توجہ اقبال کی شاعری میں موجود سوالات کی اس پختگی پر پڑی جو معرفت کا وسیلہ ہے اور ان سوالات سے ایک ایسی ذہنی تربیت اور اخلاقی قدروں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جو سوال کرنے والے کو دوسروں کے نزدیک اہم بناتی ہیں۔ انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں اقبال کی فارسی شاعری سے مثالیں پیش کیں اور اپنی ترجیح بھی درج کر دی:

'' اقبال کے ہاں سب سے زیادہ شاعرانہ، سب سے زیادہ صوفیانہ، سب سے زیادہ

مابعدالطبیعاتی سوالیہ اشعار یہ ہیں:

درون سینہء ما سوز آرزو ز کجاست؟
سبوز ماست، ولے بادہ در سبو ز کجاست؟
گرفتم این کہ جہاں خاک و ما کف خاکیم
بہ ذرہ ذرہء ما درد جستجو ز کجاست؟
نگاہ ما بہ گریبان کہکشاں افتد
جنون ما کجاء شو ر ھائے ھو ز کجاست؟ (۱۷)

ادبی رسایل کے اداریوں کو تنقید میں مناسب مقام نہیں دیا گیا،تعلیمی اداروں کے رسائل کے حوالے سے تو اس کا امکان معدوم تر ہے۔مظفرعلی سید نے اپنے زمانہء طالب علمی میں گورنمنٹ کالج، لاہور کے ادبی مجلّے **راوی** کے لیے جو اداریے تحریر کیے وہ اپنے اندر اختصاص اور تنقیدی شان رکھتے ہیں۔ انھوں نے معاصر ادب کے حوالے سے اہم تر ادبی موضوعات کا احاطہ کیا۔ معاملہ روایت کی طاقت کا ہو یا سماجی سطح پر مذاقِ سخن کا شکوہ ہو، ادبی جمود کی بحث ہو یا ادھوری رہ جانے والی تخلیق امنگ کا تجزیہ ہو، مظفرعلی سید نے معاصرادبی مسایل کو اپنے اداریوں کا موضوع بنایا اور اس اعتبار سے وہ اپنے پیش رو مدیران اور بعد میں آنے والوں سے یکسر ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی کی تحریروں سے طالب علمی کے زمانے کو منہا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس عہد میں رنگ و روپ کے قصوں سے مفر ممکن ہے اور نہ ہی اس عہد کی معصوم شرارتوں اور جذبوں سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر پطرس بخاری کے مضامین میں ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''، ''ہاسٹل میں پڑنا''، ''میبل اور میں'' اور ''کوائفِ کواڈرینگل'' میں سارا منظر گورنمنٹ کالج، لاہور میں ان کے زمانۂ طالب علمی اور ہاسٹل کے روز و شب کے گرد گھومتا ہے۔ لطف یہ کہ ان کے یہ مضامین ان کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہیں اور **راوی** ہی میں ان کی اولیں اشاعت ہوئی تھی۔ سید امتیاز علی تاج، راشد، فیض ایسے مشاہیر کی ابتدائی تخلیقات **راوی** میں جب شایع ہوئیں تو ان پر زمانہء طالب علمی کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور چڑھا ہوا ہے۔مظفرعلی سید کی ان نثری تحریروں میں زمانۂ طالب علمی کی جھلک کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تحریروں کا رنگ ڈھنگ خالصتاً تنقیدی نوعیت کا ہے۔ انھیں خود اس بات کا احساس تھا کہ انھوں نے اپنے اداریوں میں طالب علمی کے شوخ رنگ نہیں بھرے۔اس امر کا اظہار انھوں نے 'راوی' میں اپنے آخری اداریے میں کیا:

> ''وہ محبوب جو اس چار دیواری کے ہر سنگ وخشت میں بسا رہا ہے اور اس کا روپ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، اوپن ائیر تھیٹر میں یا ٹاور کے سامنے سکینڈل پوائنٹ پر، ہر جگہ اسی زندگی اور اسی توانائی سے سامنے آتا رہا ہے ان صفحوں میں اکثر غائب رہا ہے۔'' (۱۸)

یہ اداریے نہ صرف مظفرعلی سید کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہیں بلکہ اپنے عہد کی ادبی فضاؤں کی تاریخ ان میں سانس لیتی ہے۔ انہیں رسایل کی فائلوں سے نکال کر یکجا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ راوی کی فائل ماسوائے

گورنمنٹ کالج لاہور کے کہیں اور دستیاب نہ ہو سکے۔سید صاحب کی دیگر غیر مدون تحریریں تو نگاہ میں باسانی آ سکتی ہیں لیکن راوی کی سرکولیشن کم ہونے کے سبب یہ اداریے نظر سے چوک بھی سکتے ہیں۔ان تحریروں سے عدم توجہی کرنا اور قدرے غفلت کا مظاہرہ کرنا ہمارے تہذیبی شعور کے منافی ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

(۱) مظفر علی سید،''روایت اور اجتہاد''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۴، شمارہ۱، (نومبر ۱۹۵۰ء) ص۱۔

(۲) مظفر علی سید،''ہماری ادبی فضا''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور جلد۴۴، شمارہ۲، (جنوری ۱۹۵۱ء) ص۲۔

(۳) مظفر علی سید،''ادب اور بنیا پن''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۴، شمارہ۳، (مئی ۱۹۵۱ء) ص۲۔

(۴) ---ایضاً---ص۳

(۵) ---ایضاً---

(۶) مظفر علی سید،''موجودہ ادبی جمود''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور' جلد۴۴، شمارہ۴، (جون ۱۹۵۱ء) ص۳۔

(۷) انتظار حسین، **چراغوں کا دھواں**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص۹۴۔

(۸) ''شاعری کا ایک رومانی تصور''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۵، شمارہ۱، (نومبر ۱۹۵۱ء) ص۱۔(بہ حوالہ)

(۹) مظفر علی سید،''مذاقِ سخن''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۵، شمارہ۲، (جنوری ۱۹۵۲ء) ص۵۔

(۱۰) مظفر علی سید،''نہیں رہتا چراغ''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۵، شمارہ۳، (مارچ ۱۹۵۲ء) ص۳۔

(۱۱) میراجی کے عنوان سے ان کا مضمون **راوی**، جلد۴۴، شمارہ۱، نومبر ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔مظفر علی سید نہ صرف اس رسالے کے مدیر تھے بلکہ ان کی ادارت میں اس رسالے کا یہ اولیں شمارہ بھی تھا۔

(۱۲) 'اقبال کی سوالیہ شاعری' کے عنوان سے یہ مضمون **راوی**، جلد۴۵، شمارہ۴، مئی ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا۔

(۱۳) مظفر علی سید، میراجی، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۴، شمارہ۱، (نومبر ۱۹۵۰ء) ص۵۰۔

(۱۴) --- ایضاً---ص۵۱۔

(۱۵) -- ایضاً---

(۱۶) مظفر علی سید، اقبال کی سوالیہ شاعری، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور ، جلد۴۵، شمارہ۴، مئی ۱۹۵۲ء ص۶۲۔

(۱۷) ---ایضاً---ص ۶۷۔

(۱۸) مظفر علی سید،''پتہ ٹوٹا ڈال سے''، مشمولہ **راوی** گورنمنٹ کالج، لاہور، جلد۴۵، شمارہ۴، (مئی ۱۹۵۲ء)